دستِ زلیخا

مشتاق احمد یوسفی

بابائے انگریزی ڈاکٹر سموئیل جانسن کا یہ قول دل کی سیاہی سے لکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص روپے کے لالچ کے علاوہ کسی اور جزبے کے تحت کتاب لکھتا ہے،اس سے بڑا احمق روئے زمین پر کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اس کُلّیے سے حرف بہ حرف اتّفاق ہے،بشرطیکہ کتاب سے مراد وہی ہے جو ہم سمجھے ہیں،یعنی چیک بک یا روکڑبہی۔ دیباچے میں یہ وضاحت ازبس ضروری ہے کہ یہ کتاب کس مالی یا الہامی دباؤسے نڈھال ہوکر لکھی گئی۔چنانچہ جو اہلِ قلم ذہین ہیں ،وہ مشک کی طرح خود بولتے ہیں۔جو ذرا زیادہ ذہین ہیں ،وہ اپنے کندھے پر دوسروں سے بندوق چلواتے ہیں۔ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے مضمر ہیں، جو خودکشی میں ہوتے ہیں۔ یعنی تاریخِ وفات ،آلۂ قتل اور موقعِ واردات کا انتخاب صاحبِ معاملہ خود کرتا ہے۔اور تعزیراتِ پاکستان میں یہ واحد جرم ہے،جس کی سزا صرف اس صورت میں ملتی ہے کہ ملزم ارتکابِ جرم میں کامیاب نہ ہو۔1961 میں پہلی ناکام کوشش کے بعد بحمداللہ ہمیں ایک بار پھر یہ سعادت بقلم خود نصیب ہو رہی ہے۔تیشے بغیر مرنہ سکا کوہن اسدؔ۔

یہ کتاب 'چراغ تلے' کے پورے آٹھ سال بعد شائع ہو رہی ہے۔جن قدردانوں کو ہماری پہلی کتاب میں تازگی،زندہ دلی اور جواں سالی کا عکس نظر آیا، ممکن ہے ان کو دوسری میں کہولت کے آثار دکھلائی دیں۔اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی عمر میں آٹھ سال کا اضافہ ہوچکا ہے۔

انسان کو حیوان ظریف کہا گیا ہے۔ لیکن یہ حیوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔اس لیے کہ دیکھا جائے تو انسان واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس ہوجاتا ہے۔انسان واحد جاندار ہے جسے خلاّقِ عالم نے اپنے حال پر رونے کے لیے غدودِ گریہ بخشے ہیں۔کثرتِ استعمال سے یہ بڑھ جائیں تو حسّاس طنزنگار دُنیا سے یوں خفا ہوجاتے ہیں جیسے اگلے

وقتوں میں آقا نمک حرام لونڈیوں سے روٹھ جایا کرتے تھے۔ لغزشِ غیر پر اُنہیں ہنسی کے بجائے طیش آجاتا ہے۔ ذہین لوگوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو احمقوں کا وجود سِرے سے برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ لیکن جیسا کہ مارکوئس دی سید نے کہا تھا، وہ بھول جاتے ہیں کہ سبھی انسان احمق ہوتے ہیں۔ موصوف نے تو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر تم واقعی کسی احمق کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے تو خود کو اپنے کمرے میں مُقفّل کرلو اور آئینہ توڑکر پھینک دو۔

لیکن مزاح نگار کے لیے نصیحت، فصیحت اور فہمائش حرام ہیں۔ وہ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قدّآدم دیوارِ قہقہہ کھڑی کرلیتا ہے۔ وہ اپنا روئے خنداں، سورج مکھی پھول کی مانند، ہمیشہ سرچشمۂ نور کی جانب رکھتا ہے اور جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رُخ اس سمت کرلیتا ہے، جدھر سے وہ پھر طلوع ہوگا۔

ہمہ آفتاب بینم، ہمہ آفتاب گویم
نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

حِسّ مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حِس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر مقام سے آسان گزر جاتا ہے۔

بے نشّہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی

یوں تو مزاح، مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حل ہوجاتے ہیں، بالخصوص اُردو ادب میں۔ لیکن مزاح کے اپنے تقاضے، اپنے ادب آداب ہیں۔ شرط اوّل یہ کہ برہمی، بیزاری اور کدورت دل میں راہ پائے۔ ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خود شکاری کا کام تمام کردیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی اُنگلی نہ اُٹھا سکے کہ ''یہ دُھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟'' مزاح نگار اس وقت تک تبسّمِ زیرِ لب کا سزاوار نہیں، جب تک اس نے دُنیا اور اہلِ دنیا سے رَج* کے پیار نہ کیا ہو۔ ان سے۔ ان کی بے مہری و کم نگاہی سے۔ ان کی سرخوشی و ہوشیاری سے۔ ان کی تر دامنی اور

---

*رَج کے (پنجابی): جی بھر کے

تَقَدُّس سے۔ایک پیمبر کے دامن پر پڑنے والا ہاتھ گُستاخ ضرور ہے،مگر مُشتاق و آرزومند بھی ہے۔یہ زُلیخا کا ہاتھ ہے۔ خواب کو چھوکر دیکھنے والا ہاتھ۔

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی

ایک صاحبِ طرز ادیب نے، جو سخن فہم ہونے کے علاوہ ہمارے طرفدار بھی ہیں (تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوتا—— کی حدتک) ایک رسالے میں دبی زبان سے شکوہ کیاکہ ہماری شوخیِ تحریر مسائلِ حاضرہ کے عکس اور سیا سی سوز و گداز سے عاری ہے۔اپنی صفائی میں ہم مختصراً اتنا ہی عرض کریں گے کہ طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہوجاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مولانا رومی کہ رمزوکنایہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں، ایک اندھیری رات کی بات سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جنگل بیابان میں ایک بچّہ اپنی سے چمٹ کر کہنے لگاکہ امّی! اندھیرے میں مجھے ایک کالا دیو نظر آتا ہے اور مارے ڈر کے میری تو گھگّی بندھ جاتی ہے۔ماں نے جواب دیا، بیٹا! تو مرد بچّہ ہے۔ خوف کو دل سے نکال دے۔اب کی دفعہ جیسے ہی وہ دکھائی دے، آگے بڑھ کے حملہ کر دینا۔وہیں پتہ چل جائے گاکہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔ بچّے نے پوچھا، امّی !اگر اس کالے دیوکی امّی نے بھی اُسے یہی نصیحت کر رکھی ہو تو ۔۔۔۔؟

کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟

کچھ دن وہ رسالہ کہ سرخیلِ دانشوراں تھا اور جس میں راقم الحروف کی سیا سی بے حسی و بے رغبتی کی تشخیص کی گئی تھی، نواب کالا باغ کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ ہمارے قدردان نے ایک پی ۔ڈبلیو۔ ڈی۔ کے ٹھیکیدار کے ہاں بحیثیت پبلسٹی منیجر ملازمت کرلی۔ فقیر نے بھی یارانِ نا مہرباں اور شہرِ بے اماں سے رُخصت چاہی اور بوریا بدھنا سنبھال، داتا کی نگری کی راہ لی

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رُسوا شدیم

'پروفیسر'، 'بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے' اور 'بائی فوکل کلب' اِسی سفرِ شوق کی یادگار ہیں۔ پڑھنے والوں کا ان کا رنگ مختلف نظر آئے تو یہ زندہ دلانِ لاہور کا فیضانِ صحبت ہے۔

لوگ کیوں، کب اور کیسے ہنستے ہیں، جس دن اِن سوالوں کا صحیح صحیح جواب معلوم ہوجائے گا، انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا یہ سوال کہ کس پر ہنستے ہیں؟ تو اس کا انحصار حکومت کی تاب و رواداری پر ہے۔ انگریز صرف ان چیزوں پر ہنستے ہیں، جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں ـــــ پنچ کے لطیفے، موسم، عورت، تجریدی آرٹ۔ اس کے برعکس، ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں، جو اَب ہماری سمجھ میں آگئی ہیں۔ مثلاً انگریز، عشقیہ شاعری، روپیہ کمانے کی ترکیبیں، بنیادی جمہوریت۔

فقیر گالی، عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے آزُردہ نہیں ہونا چاہئیے۔ یہ قولِ فیصل ہمارا نہیں، مولانا عبید زاکانی کا ہے (ازدشنامِ گدایاں و سیلیٔ زناں وزبانِ شاعراں و مسخرگاں مرنجید) مزاح نگار اس لحاظ سے بھی فائدے میں رہتا ہے کہ ممکن ہے، اس میں بھی تفنُّن کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو، جو غالباً موسم کی خرابی کے سبب اس کی سمجھ نہیں آرہا۔ اس بنیادی حق سے دستبردار ہوئے بغیر، یہ تسلیم کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ہم زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلُّفِ زائد تصوّر نہیں کرتے۔ یہ اعترافِ عجز اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آج کل بعض اہلِ قلم بڑی کوشش اور کاوِش سے غلط زبان لکھ رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار بے دھیانی یا محض آلکس میں صحیح زبان لکھ جائیں تو اور بات ہے۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی؟